شبلی اور عربی تنقید

ثمینہ شہناز

Samina Shahnaz

Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. Islamia College For Women, Faisalabad.

ڈاکٹر جمیل اصغر

Dr. Jameel Asghar

Associate Professor, Department of Urdu,
Govt. Post Graduate College, Samanabad, Faisalabad.

Abstract:

Historian, biographer and poet, Shiblee holds an indispensible position in the tradition of Urdu criticism. Shiblee has great share in Urdu Literature. He has made his centre of attention at a time, history, religion, literature and excelled in every position. But as a critic he seems to be top of all. The growth of crtitical consciousness of Shiblee is directrly flourished under the oriental critical back drop. Arabic critical tradition seems more prominent in his critical ideology. Under discussion article seems more under the Arabic cricitical tradition in terms of change in the critical ideology.

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کو بلاشبہ اردو تنقید کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ مشاعروں، اصلاحوں، تقریظوں، تذکروں اور شعرا کے انفرادی تنقیدی شعور سے ہوتے ہوئے معیارات یہاں پہنچ کر تنقیدی اصولوں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ اس دور کے منظر نامے پر ہمیں تین بڑے نام نظر آتے ہیں جن میں آزاد، حالی اور شبلی شامل ہیں۔ ان میں حالی اور شبلی کو باقاعدہ نقاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں اصحاب کے تنقیدی شعور نے براہِ راست مشرقی تنقیدی روایت کے زیرِ سایہ پرورش پائی تھی۔ ان میں خصوصاً شبلی کے ہاں دیکھا جائے تو فارسی کے ساتھ ساتھ عربی تنقیدی روایت کا رنگ

بہت ہی پختہ ہے۔

عربی نقد وشعر میں لفظ اور معانی کی ایک دوسرے پر ترجیح کی بحث قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ اہم بھی ہے۔قدیم ناقدین میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو شعر میں معانی کی نسبت الفاظ کی بالادستی کا قائل ہے۔ان کا خیال ہے کہ شاعر اور خطیب دونوں کے لیے لازم ہے کہ الفاظ،تشبیہات، تراکیب اور بندشوں کا استعمال اس طرح سے کریں کہ ان کا کلام ادبی شہ پارہ بن جائے۔ڈاکٹر شاداب عالم جاحظ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''معنی تو پیش پا افتادہ ہوتے ہیں اسے تو عربی، عجمی، دیہاتی، شہری سب جانتے ہیں ۔ دراصل اہمیت اوزان کی، اچھے الفاظ کے استعمال کی اور زبان کے سہل مزاج ہونے کی ہے۔''(۱)

اس گروہ کا خیال ہے کہ کسی بھی چیز کا تصور، جذبہ یا احساس تو ہر شخص کے پاس کمی بیشی کے ساتھ بلا تخصیص موجود ہوتا ہے مگر کمال تو یہ ہے کہ اس جذبے،احساس یا شے کے لیے عمدہ الفاظ کا انتخاب کرنا اور الفاظ کی مناسب ترتیب سے اس طرح تصویر کشی کرنا ہے کہ سننے اور پڑھنے والے کی آنکھوں میں تصویر کھنچ جائے۔ابو ہلال عسکری نے بھی الفاظ کی فضیلت پر سخت مؤقف اختیار کیا ہے۔ابو ہلال عسکری کے خیال کو''کتاب الصناعتین'' کے حوالے سے محمد سمیع اختر اپنے تحقیقی مقالے''عربی تنقید نگاری قدیم وجدید رجحانات کا تقابلی جائزہ'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''افکار و معانی صرف اتنا مطلوب ہے کہ درست ہوں۔کسی بھی ادبی کلام کی قبولیت اور شہرت کا زیادہ تر انحصار الفاظ پر ہوتا ہے۔''(۲)

قدامہ بن جعفر جیسا نقاد بھی جس کے تنقیدی تصورات ذاتی اور شخصی تاثر لیے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ علمی اور معروضی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں، نے بھی لفظ کو معنی پر فوقیت دی ہے۔ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی''نقد الشعرا'' کے حوالے سے قدامہ کا قول نقل کرتے ہیں:

''طرزِ بیان شعر کا اصلی جزو ہے۔مضمون و تخیل کا بذاتِ خود فحش ہونا شعر کی خوبی کو زائل نہیں کرتا۔شاعر ایک بڑھئی ہے لکڑی کی اچھائی یا برائی اس کے فن پر اثر انداز نہیں ہوتی۔''(۳)

عربی تنقید میں جہاں لفظ کی اہمیت کے حوالے سے سخت مؤقف پایا جاتا ہے وہاں معنی کی افضلیت کے حوالے سے بھی بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔جرجانی نے اس خیال کو رد کر دیا ہے کہ معنی پیش پا افتادہ ہوتے ہیں۔ابوالکلام قاسمی، جرجانی کے خیالات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تصور غلط ہے کہ معنی تو ہر شخص کو معلوم ہیں، خواہ وہ جاہل ہو یا دیہاتی ۔ واقعہ یہ ہے کہ معنی کی جدت ہی مرجع حسن ہے۔ایک

عبارت دوسری عبارت سے محض اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ وہ معنی کے اعتبار سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔''(۴)

ابن شرف بھی جرجانی کے اس نظریے کے حامی نظر آتے ہیں:

''الفاظ تو معنی کے خادم ہوتے ہیں۔ اگر الفاظ و معانی دونوں ہی اچھے ہوں تو یہ بہتر بات ہے اور ہونا بھی چاہیے۔''(۵)

جہاں الفاظ اور معنی کی افضلیت کے حوالے سے عربی تنقید میں دو مختلف الخیال گروہ موجود تھے وہاں ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو اس معاملے میں معتدل رویے کا حامل تھا اور جس کے نزدیک لفظ و معنی یکساں اہمیت کے حامل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لفظ و معنی دونوں میں تناسب اور توازن ضروری ہے اور دونوں ہی اہم ہیں۔ ابن قتیبہ لفظ و معانی کو یکساں اہمیت دے کر نئی روایت کا آغاز کرتے ہیں۔ بقول ابن قتیبہ:

''بہترین شعر وہ ہے جس کے الفاظ پرکشش اور معانی بلند ہوں۔ اگر الفاظ معانی کے مطابق نہ ہوں یا معانی الفاظ کا ساتھ نہ دیں تو یہ کلام کا عیب ہے۔''(۶)

ابوبکر باقلانی بھی ابن قتیبہ کے ہم نوا نظر آتے ہیں:

''معانی کو الفاظ کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس طرح کہ نہ تو الفاظ کلام میں معانی سے زیادہ بھر دیے جائیں اور نہ ایسے معانی استعمال کیے جائیں جو الفاظ سے مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ اچھے اور پرکشش کلام کی پہچان یہ ہے کہ اس میں دونوں کا مناسب استعمال ہو اور یہی میرا پیمانہ ہے۔''(۷)

شبلی کے نظامِ نقد پر روشنی ڈالیں تو شبلی بھی مشرقی تنقید اور بالخصوص عربی تنقید کی الفاظ و معانی کی فضیلت کی اس بحث سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ابن رشیق کی کتاب ''العمدہ'' کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کیا ہے:

''لفظ جسم ہے اور مضمون روح ہے۔ دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہے کہ جیسا روح اور جسم کا ارتباط، کہ وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگا۔۔۔۔ اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں اور مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہوگا اور مضمون کی خرابی الفاظ پر اثر کرے گی۔ اگر مضمون لغو ہو اور الفاظ اچھے ہوں تو الفاظ بھی بے کار رہوں گے۔''(۸)

ابن رشیق کے اس قول کو نقل کرنے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ شبلی ان سے متفق ہیں کیوں کہ وہ

اسے ایک قول سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں:

''بڑے بڑے خیالات اور جذبات لفظ کے تابع ہوتے ہیں۔ ایک لفظ ایک بہت بڑے خیال یا بہت بڑے جذبہ کو مجسم کر کے دکھا سکتا ہے۔ ایک بہت بڑا مصور ایک مرقع کے ذریعہ غیض وغضب، جوش وقہر، عظمت اور شان کا جو منظر دکھا سکتا ہے۔ شاعر ایک لفظ سے وہی اثر پیدا کر سکتا ہے۔''(۹)

شبلی چونکہ براہِ راست عربی نظام نقد سے متاثر تھے لہٰذا وہ زیادہ تر لفظ کی اہمیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''شعر العجم'' جلد چہارم میں ''لفظ'' کو موضوع بناتے ہیں اور تفصیلاً بحث کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کو مختلف حوالوں سے زیرِ بحث لاتے ہیں۔ کلام میں الفاظ کی اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ کے انتخاب، توازن، تناسب اور ترتیب کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ ان تمام مباحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کے ہاں لفظ کو معنی پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ اپنی عملی تنقید میں شعرا پر جو تبصرہ کرتے ہیں ان میں بھی وہ الفاظ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً:

''فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ الفاظ، بندش اور طرزِ ادا اس قدر موٴثر ہے کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے۔''(۱۰)

شبلی جہاں جاحظ اور ابو ہلال عسکری کی طرح لفظ کی اہمیت کے قائل نظر آتے ہیں وہاں ابن رشیق کے بھی ہم نوا ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''مضمون کتنا ہی بلند اور نازک کیوں نہ ہو اگر الفاظ مناسب نہیں ہیں تو شعر میں کچھ تاثیر پیدا نہ ہو سکے گی۔ اس لیے شاعر کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ جو مضمون اس کے خیال میں آیا ہے اس درجہ کے الفاظ اس کو میسر آ سکیں گے کہ نہیں اگر نہ آ سکیں تو اس کو بلند مضمون کو چھوڑ کر انھیں سادہ اور معمولی مضامین پر قناعت کرنی چاہیے۔''(۱۱)

شبلی مختلف شعرا کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے جس طرح الفاظ کو معیار بناتے ہیں اور الفاظ کی اہمیت کو جس طرح بیان کرتے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کو معنی پر فوقیت دیتے ہیں مگر جب شبلی کذب اور مبالغے کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو الفاظ اور ہیئت کی حیثیت ضمنی ہو جاتی ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر غالب آ جاتا ہے، معنی اور مفہوم اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ بقول ابوالکلام قاسمی:

''ذرا غور کیجیے کہ ایک اخلاقی نقطۂ نظر کا حامل آدمی شاعری کی لفظی اور ہیئتی خصوصیات کو ہی سب کچھ سمجھ کر اپنے نقطۂ نظر سے کیونکر

انصاف کرسکتا ہے۔''(۱۲)

کیونکہ جب شبلی کذب اور مبالغہ کے حوالے سے بحث کرتے ہیں تو الفاظ کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے اور اخلاقی نقطہ نظر غالب آ جاتا ہے، معنی اور مفہوم اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔قدیم عرب ناقدین کے ہاں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث رہا ہے کہ کیا شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اشعار میں صداقت اور حقیقت کے اصولوں کی پاسداری کرے اور صرف ایسے ہی خیالات وافکار پیش کرے جو فی الواقع درست اور صحیح ہوں۔عربی تنقید میں سب سے پہلے اس مسئلے کو ابن طباطبا نے اٹھایا۔اس نے شاعر سے جو مطالبہ کیا اس کو ڈاکٹر سمیع اختر اپنے مقالے میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

''وہ اپنی تشبیہ اپنے خیالات اور اپنے افکار ونظریات میں صادق القول ہو۔۔۔۔اس کا ماننا یہ ہے کہ قصیدے میں فنی جمال تناسب پیدا کرتا ہے جسے طے کرنے میں عقل مدد کرتی ہے اور عقل صرف سچے خیالات سے متاثر ہوتی ہے۔''(۱۳)

عرب ناقدین کے نزدیک کسی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اصطلاحی اعتبار سے ایک کا نام مبالغہ، دوسری صورت کا غلو اور تیسری صورت کا نام کذب ہے۔قدیم عربی تنقید میں ابن المعتز نے اس کے لیے مرتبہ''افراط فی الصفتہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔یعنی کسی کی صفت کو حد سے بڑھا کر پیش کرنا اور عربی شاعری کا یہ بہت بڑا وصف سمجھا جاتا تھا۔مبالغہ کے بارے میں قدامہ بن جعفر نے بڑی دوٹوک رائے دی ہے کہ:

''کوئی شاعر اس وقت تک عظمت حاصل نہیں کرسکتا جب تک اپنے کلام میں مبالغہ اختیار نہ کرے، جو لوگ شاعری پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ مبالغہ کو مستحسن قرار دیا ہے۔''(۱۴)

جبکہ مبالغہ کے بارے میں ابن رشیق کی رائے قدامہ بن جعفر اور ابن طباطبا سے مختلف ہے۔ ابن رشیق کی تنقید پر اخلاقیات اور مذہب کا رنگ غالب ہے۔اس لیے وہ مذہب کے حوالے سے مبالغہ کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ابوالکلام قاسمی ابن رشیق کا قول نقل کرتے ہیں:

''سب سے بہتر کلام وہ ہے جس پر خدا کی کتاب سے کوئی دلیل مل جائے۔''(۱۵)

شبلی مبالغہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔مبالغہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں مگر زیادہ تر آئمہ فن (عربی نقاد) اس کے مخالف ہیں۔اس کے بعد شبلی اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے حسان بن ثابت کے قول کو نقل کرتے ہیں:

''اچھا شعر وہ ہے جب پڑھا جائے تو لوگ بول اٹھیں کہ سچ

ہے۔''(۱۶)

اس کے علاوہ شبلی ابن رشیق کی کتاب ''العمدہ'' کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنی کتاب میں واقعیت کی تائید میں بہت سے علمائے فن کے اقوال نقل کیے ہیں۔شبلی کا یہ دعویٰ سو فی صد درست نہیں جہاں ابن رشیق مبالغہ کی مخالفت کرتا ہے وہاں بہت سے ایسے علما کے اقوال بھی نقل کرتا ہے، جو کہ مبالغہ کے حق میں ہیں۔ابن رشیق بلاشبہ حسان بن ثابتؓ سے متاثر ہے اور شعر کے لیے واقعیت اور صداقت کو ضروری قرار دیتا ہے۔شبلی جب عرب نقادوں کے ان خیالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو صرف ان خیالات پر اکتفا کر کے ابن رشیق کے ہم خیال نہیں ہو جاتے بلکہ وہ مبالغہ کو سماجی اور معاشرتی معاملات سے ہم آہنگ کرتے ہیں وہ مبالغہ کو شعر کے بنیادی عناصر میں سے نہیں سمجھتے بلکہ اسے حالات اور ماحول کی پیداوار کہتے ہیں:

> ''اس تقریر سے عرض یہ ہے کہ جن شعرا کے کلام میں مبالغہ کی خوبی پر استدلال کیا جاتا ہے۔اس کی نسبت یہ دیکھو کہ وہ کس زمانہ کے ہیں، اگر متاخرین میں ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تمدن کی خرابی ہے جس کا اثر مذاق پر بھی پڑا ہے کہ لوگ مبالغہ کو پسند کر رہے ہیں۔یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تمدن کی خرابی نے شاعر اور سامعین دونوں کے مذاق کو خراب کر دیا ہے۔''(۱۷)

اس اقتباس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی شاعری میں مبالغہ کو بالکل غلط تصور کرتے ہیں اور جس زمانے کی شاعری میں مبالغہ پایا جاتا ہے اس کو وہ مخصوص تمدنی حالات سے جوڑتے ہیں مگر شبلی کا رویہ اس معاملہ میں انتہائی معتدل ہے۔شبلی کے نزدیک اگر کہیں مبالغے کی گنجائش نکلتی بھی ہے تو محض تخیل کے لبادے میں بصورت دیگر وہ شاعری، جس کا مقصد تفریح طبع نہ ہو بلکہ اس کا مقصد قومی یا اخلاقی جذبات کی ترویج ہو وہاں مبالغہ جائز نہیں ہے:

> ''وہ شاعری جو ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیروزبر کر سکتی ہے، جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے، جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ وہ واقعیت اور اصلیت سے خالی ہو تو کچھ کام نہیں کر سکتی۔''(۱۸)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کے نزدیک تخیلی شاعری کا مقصد صرف تفریح طبع ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سب سے کارگر ہتھیار مبالغہ ہے۔چونکہ تفریح کا انحصار مبالغہ پر ہوتا ہے لہٰذا مبالغہ کی موجودگی اور عدم موجودگی شعر کے لطف پر اثر انداز ہوتی ہے۔اس کے برعکس مقصدی

شاعری مبالغے سے پاک ہوتی ہے۔شبلی کے خیال میں مبالغہ بذاتِ خود تخیل کے بطن میں سے جنم لیتا ہے اور اگر شاعر تخیل کی رنگ آمیزی کے بغیر مبالغہ کا استعمال کرتا ہے تو صریحاً جھوٹ دکھائی دیتا ہے اور کلام میں حسن کی بجائے سقم بن جاتا ہے۔شبلی کے خیال میں شاعری کا کام انسانی جذبات کو مشتعل کرنا ہے اس لیے وہ بعض حالات میں مبالغہ کو جائز اور مناسب قرار دیتے ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ وہ مبالغے میں حد سے تجاوز کرنے اور اس کے مضر اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔شبلی کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ شاعری اصلیت کا سو فی صد اظہار نہیں ہوتی۔شاعر کے لیے اصل چیز پر رنگ و روغن چڑھا کر پیش کرنا انتہائی ضروری ہے تبھی کلام میں تاثیر پیدا ہوگی۔وہ عاشقانہ جذبات کے اظہار میں مبالغہ کو بڑی حد تک درست مانتے ہیں:

> ’’عشقیہ اشعار میں مبالغے اس لیے چنداں بدنما معلوم نہیں ہوتے کہ شاعر میں گو وہ باتیں نہ ہوں لیکن عشق و محبت کے جوش میں اس قسم کے واقعات ناممکن نہیں۔‘‘(۱۹)

غرض عربی ناقدین کی طرح شبلی بھی اخلاقی اور معاشرتی نقطہ نظر سے مبالغہ کو پسند نہیں کرتے مگر فنی نقطہ نظر سے مبالغہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔

مولانا شبلی کے زیرِ بحث موضوعات میں سے ایک موضوع بلاغت ہے۔شبلی نے بلاغت اور اس کے لوازمات کو ’’شعرالعجم‘‘ کے اصولی مباحث میں بھی موضوع بنایا ہے۔اس کے ساتھ ’’فن بلاغت‘‘ پر ایک طویل مضمون لکھا ہے۔’’موازنہ انیس و دبیر‘‘ میں تقابل کی بنیاد جس چیز کو بتایا ہے وہ فصاحت و بلاغت ہے۔اپنے مضمون فن بلاغت میں وہ لکھتے ہیں:

> ’’مسلمانوں نے جو علوم و فنون خود ایجاد کیے جن میں وہ کسی کے مرہونِ منت نہیں۔ان میں سے ایک فن بلاغت بھی۔‘‘(۲۰)

انھوں نے اپنے مضمون میں بلاغت کو شعری محاسن میں سے قرار دیتے ہوئے اسے بلا شرکتِ غیرے عربی ادب کا کارنامہ بتایا ہے۔وہ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں بلاغت کا تصور ارسطو سے آیا۔شبلی کا کہنا ہے کہ اس کی کتاب ’’ریطوریقا‘‘ فن خطابت کے بارے میں ہے نہ کہ بلاغت کے بارے میں۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’چنانچہ ارسطو نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ واعظ، وکیل، حکیم اور فریق مقدمہ وغیرہ کی تقریر کے اصول کیا ہیں۔ ہر ایک کے طریقہ استدلال کو دوسرے سے کیسے مختلف کہنا چاہیے۔‘‘(۲۱)

شبلی کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں ارسطو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ لوگوں مثلاً واعظ، وکیل، استاد، خطیب، حکیم وغیرہ کے بارے میں اصولی بحث کرتا ہے کہ انھیں اپنا مدعا یا مؤقف کیسے بیان

کرنا چاہیے۔ جبکہ بلاغت شاعرانہ حسن ہے اور شعر وشاعری کے حوالے سے زیرِ بحث آتی ہے۔ شبلی نے نہ صرف ارسطو اور بلاغت کے حوالے سے پائی جانے والی غلط فہمی کو دور کیا بلکہ انھوں نے تاریخی حوالے سے بتایا ہے کہ مسلمان صرف اس فن کے موجد ہی نہیں بلکہ بلاغت کے اصول وقواعد وضع کرنے والے بھی مسلمان ہی ہیں۔ شبلی ''شعر العجم''میں لکھتے ہیں:

> ''ابن اثیر نے ''مثل السائر'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ یونانیوں نے فن بلاغت پر جو کچھ لکھا ہے اگر چہ اس کا ترجمہ عربی میں ہو چکا ہے لیکن میں اس سے واقف نہیں اور اس لیے اس فن میں، میں نے جو نکتے اضافہ کیے ہیں ان میں سے کسی کا بس مقلد نہیں بلکہ مجتہد ہوں۔''(۲۲)

اور شبلی کی یہ بات درست اور مبنی بر حقائق ہے مگر اس سے پہلے بھی مختلف عرب نقادوں کے ہاں ان کے تنقیدی خیالات میں بلاغت کا تصور نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شاداب عالم:

> ''اگر چہ حافظ نے بیان و بلاغت کے تعین، نظریہ اور قاعدہ سے بحث نہیں کی مگر پھر بھی اس کی تحریروں سے اس عہد کے بیان و بلاغت کے تصور و نظریہ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''(۲۳)

شبلی نعمانی جہاں ''موازنہ انیس و دبیر'' میں فصاحت و بلاغت کو بنیادی موضوع بنا کر تقابلی جائزہ لیتے ہیں وہاں ''شعر العجم'' میں بھی جب ایرانی شعرا کے کلام کو زیرِ بحث لاتے ہیں وہاں بھی بلاغت کو محسنات کلام میں سے گردانتے ہیں۔ شبلی بلاغت کی تعریف علمائے معنی (عربی نقادوں) کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

> ''بلاغت کی تعریف علمائے معنی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے مطابق ہو اور فصیح ہو۔ اقتضائے حال کے مطابق ہونا ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع واسالیب آ جاتے ہیں۔ بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں محض مضامین کو بھی بلیغ یا غیر بلیغ کیا جا سکتا ہے۔ بلاغت الفاظ دراصل بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اصل اور اعلیٰ درجے کی بلاغت معنی کی بلاغت ہے۔''(۲۴)

بلاغت کے لیے کلام کا اقتضائے حال کے مطابق ہونا اور فصیح ہونا یہ دو ایسی شرطیں ہیں جن کے دائرے میں مضمون اور معنی کے ساتھ ساتھ لفظ بھی شامل ہیں چونکہ فصاحت کا براہِ راست تعلق لفظ سے ہے اور فصاحت بلاغت کی جانب پہلا قدم ہے لہٰذا شبلی اپنے مضمون میں سب سے پہلے فصاحت کو زیرِ بحث لاتے ہیں:

''فصاحت کی تعریف علمائے ادب نے یہ کی ہے کہ لفظ متنافر الحروف نہ ہو، قواعد حرفی کے خلاف نہ ہو۔''(۲۵)

اس سلسلہ میں شبلی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں کہ الفاظ کے فصیح ہونے سے کلام کی بلاغت براہِ راست متاثر ہوتی ہے:

رویا میں بھی حسینؓ کو، رویا ہی کرتے ہیں
(میرزا دبیر)
حسرت ہے کہ خواب میں بھی رویا کیجیے
(میر انیس)(۲۶)

غرض شبلی فصاحت الفاظ کے بارے میں خود بھی متضاد رائے کے حامل ہیں مگر مجموعی طور پر ان کے ہاں بلاغت کے وہی معیارات پائے جاتے ہیں جو عربی ادب میں موجود تھے اور جن کو مقام و مرتبہ متعین کرتے وقت مدنظر رکھا جاتا تھا۔ عرب ناقدین کے ہاں یہ مسئلہ بھی کافی عرصہ تک بحث کا موضوع بنا رہا کہ آیا شاعر کو مذہبی اور اخلاقی حدود کو مدِنظر رکھنا چاہیے یا نہیں۔ ڈاکٹر سمیع اختر قدامہ بن جعفر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''زمانہ اور ماحول خواہ کسی قدر کیوں نہ تبدیل ہو جائیں لیکن اشعار کی اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی جب تک ان میں اخلاقیات و مذہبیات کی تعلیم نہ ہو۔ مذہبی و اخلاقی اصول زمانے کے ساتھ تبدیل نہیں ہوا کرتے، صداقت، راست گوئی، ایفائے عہد، ایثار، اخوت و محبت وغیرہ کسی کو کسی زمانے میں عیب نہیں سمجھا جاتا۔''(۲۷)

شبلی بھی عربی نقادوں کے اس نظریے سے سو فی صد متفق نظر آتے ہیں کیونکہ ان کی نگارشات بھی اخلاقی اقدار کے سائے میں جنم لیتی ہیں۔ ان کے خیال میں شاعری ایک مؤثر ہتھیار ہے۔ اس سے بڑے سے بڑے کارنامے کیے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا استعمال مثبت اور اخلاقی حدود کے اندر رہ کر کیا جائے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

''شبلی کو شاعری میں پیغام کی بڑی جستجو رہتی ہے۔ اس طرح وہ شاعری میں خاص اخلاقی روح کے متلاشی رہتے ہیں۔ ایسی اخلاقی روح کے جو اجتماع انسانی کی تعمیر و تکمیل میں ممد و معاون اور اعلیٰ انسانی شرافتوں اور فضیلتوں کو ابھارنے والی ہو۔''(۲۸)

ہمیں ''موازنہ انیس و دبیر'' میں عربی تنقید کا یہی روپ نظر آتا ہے۔ موازنہ لکھتے ہوئے ان

کے سامنے کوئی جدید تنقید نہیں بلکہ عربی تنقید کا منظر نامہ ہے۔ وہ انھی بنیادوں پر انیس اور دبیر کا موازنہ کرتے ہیں جو کہ عربی تنقید میں موازنے کے لیے رائج تھیں۔ بقول کلیم الدین احمد:

> ''کہنا پڑتا ہے کہ کسی تنقید کا ساز و سامان، شبلی کا اسلوب، ان سب چیزوں میں پرانی تنقید (عربی تنقید) کی صاف کارفرمائی ہے ۔۔۔۔وہ میر انیس کی شاعری کی خصوصیات ان عنوانات کے تحت بیان کرتے ہیں، فصاحت، روزمرہ اور محاورہ، بلاغت، استعارات تشبیہات، انسانی جذبات یا احساسات، مناظر قدرت، واقعہ نگاری اور رزمیہ وغیرہ۔''(۲۹)

مذکورہ بحث کے تناظر میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شبلی نے اپنی تنقید میں عربی اصول نقد سے بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ تفصیلی جائزے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شبلی نے جن تنقیدی مسائل سے بحث کی ہے وہ براہِ راست عربی تنقیدی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں لفظ و معانی کی بحث، مبالغہ اور واقعیت، بلاغت، شاعر اخلاق اور مقابلہ و موازنہ جیسے موضوعات اہم ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شاداب عالم، ڈاکٹر، تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد، نئی دہلی: آدم پبلشرز، ۲۰۱۷ء، ص:۴۰

۲۔ محمد سمیع اختر، عربی تنقید نگاری: قدیم و جدید رجحانات کا تقابلی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی انڈیا، ۱۹۹۶ء، ص:۱۹۴

۳۔ نورالحسن نقوی، فن تنقید اور تنقید نگاری، کراچی: گرین بکس، ۱۹۶۶ء، ص:۵۷

۴۔ ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، دہلی: قومی کونسل برائے اردو، ۲۰۰۴ء، ص:۲۸۶

۵۔ شاداب عالم، ڈاکٹر، تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد، ص:۱۸۱

۶۔ عبدالعلیم، عربی تنقید کے بنیادی افکار، مشمولہ: نظریاتی تنقید، مرتب: ابوالکلام قاسمی، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء، ص:۵۲

۷۔ ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور تنقید کی روایت، ص:۲۸۱

۸۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن، ص:۴۹

۹۔ ایضاً، ص:۵۸

۱۰۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد اول، لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن، ص:۲۶۹

۱۱۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، ص:۲۷۸

۱۲۔ ابوالکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، ص:۵۲

۱۳۔ محمد سمیع اختر، عربی تنقید نگاری: قدیم و جدید کا تقابلی جائزہ، ص:۱۹۹

۱۴۔ عبدالعلیم، عربی تنقید کے بنیادی مباحث، ص:۵۴

۱۵۔ ایضاً، ص:۵۵

۱۶۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، ص:۶۳

۱۷۔ ایضاً، ص:۶۴

۱۸۔ ایضاً، ص:۶۵

۱۹۔ شبلی نعمانی، شعرالعجم، جلد چہارم، ص:۶۶

۲۰۔ شبلی نعمانی، انتخاب مضامین شبلی، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۱ء، ص:۱۹

۲۱۔ ایضاً، ص:۲۰

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۰

۲۳۔ شاداب عالم، ڈاکٹر، تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظامِ نقد، ص:۳۵

۲۴۔ شبلی نعمانی، انتخاب مضامین شبلی، ص:۲۴

۲۵۔ شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۱ء، ص:۳۵

۲۶۔ ایضاً، ص:۳۷

۲۷۔ محمد سمیع اختر، عربی تنقید نگاری: قدیم وجدید رجحانات کا تقابلی جائزہ، ص:۱۹۸

۲۸۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص:۱۵۷

۲۹۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، پٹنہ: بک امپوریم، ۱۹۸۳ء، ص:۱۱۹

☆......☆......☆